ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

مولانا حسرت موہانی کا سیاسی کردار

حسرت موہانی برعظیم کے مسلمانوں میں سب سے سینئر سیاست دان تھے۔ وہ نصف صدی تک سیاسی زندگی اور سیاسی تحریکوں میں نمایاں رہے اور اس دوران میں ان کا سیاسی اخلاق و کردار اس درجہ بے داغ رہا کہ مسلمانوں کی سیاست میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ظفر علی خان، محمد علی، شوکت علی اور ابوالکلام آزاد، ان کے بعد میدانِ سیاست میں داخل ہوئے۔ ان شخصیتوں کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض ایسے دور بھی آئے جب ان شخصیتوں کو کردہ یا ناکردہ گناہوں کی پاداش میں عوامی غم و غصہ کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن حسرت موہانی کی زندگی میں ایسا کوئی دور نہیں آیا۔ بعض لوگوں نے ان سے اختلاف کیا، لیکن ان پر کوئی الزام نہ لگا سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حسرت موہانی نے ایک تو قوم سے کبھی چندہ نہ لیا، دوسرے ایک سادہ رہن سہن رکھا۔ اور اس سادہ زندگی کے لیے ساری عمر محنت اور مشقت سے کام لیا۔ صدی کے آغاز میں بی۔ اے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان گریجویٹوں کی تعداد بہت کم تھی اور انھیں اعلیٰ مناصب مل جاتے تھے، لیکن حسرت موہانی نے کھدر کی دکان کھول لی۔ کچھ دیر وہ چلائی۔ پھر "اردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ پرانے شعرا کے دیوان چھاپے اور جو تھوڑی بہت یافت ہوئی اس سے دال روٹی چلاتے رہے۔ آخری وقت تک درویشی کا سلسلہ جاری رہا اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے، تو بالکل خالی ہاتھ گئے۔ کوئی جائداد نہ چھوڑی۔ کوئی پیسہ نہ چھوڑا۔ سیاست میں احتیاج غلام بناتی ہے اور زیادہ آسائش کی آرزو سیاسی کردار کو آلودہ کرتی ہے۔ چونکہ حسرت موہانی کی ضرورتیں بہت محدود تھیں اور انھیں کسی قسم کا لالچ نہیں تھا، اس لیے کبھی کسی دباؤ میں نہ آئے۔ جو جی میں آئی، وہ کہہ ڈالی، جو دل میں آیا، وہ کر ڈالا۔ لاریب ان کی زندگی کا یہ پہلو انھیں سیاسی تاریخ میں ایک منفرد مقام بخش دیتا ہے۔

حسرت موہانی نے اس صدی کے آغاز میں ریڈیکل سیاست کو اپنایا۔ وہ سیاست، جو انگریز کے ساتھ مفاہمت کو حرام قرار دیتی تھی، جس کا نصب العین کامل آزادی تھا۔ یہ سیاست صرف برعظیم کی سیاست نہیں تھی، پورے ایشیا کی سامراج دشمن سیاست تھی۔ اس سیاست نے جنگِ روس و جاپان میں جاپان کی جیت سے جنم پایا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایک ایشیائی قوم نے ایک یورپی قوم کو ہرایا تھا۔ اس لیے ایشیا کے بہت سے خطوں میں سامراج کے خلاف تحریکیں اٹھیں۔ برعظیم میں آربندو گھوش، بال گنگا دھر تلک اور بپن چندر پال نے سامراج دشمن تحریک کو آگے بڑھایا۔ مسلمانوں کے نزدیک سیاست شجرِ ممنوعہ تھی اور جب نہ رہی تو مسلم لیگ ابھری، جو کرسی نشینوں کی وفا شعار جماعت تھی۔ ایسے میں حسرت موہانی واحد مسلمان رہنما تھے جنھوں نے ریڈیکل سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔

مورخین کہتے ہیں کہ ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کا سیاسی حربہ گاندھی جی کی ایجاد ہے، جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ برعظیم کے عوام تشدد کا مقابلہ تشدد سے نہیں کر سکتے، اس لیے انھیں عدم تشدد کے ذریعے سے اجنبی راج کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ وہ برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں، انگریز سے میل جول نہ رکھیں اور اس کے قانون کو جائز قانون نہ سمجھیں۔ اس طریقِ کار کو انگریزی زبان میں PASSIVE RESISTANCE کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی سے قریب قریب دس سال پہلے یہ طریقِ کار حسرت موہانی نے تجویز کیا تھا۔ اس سلسلے میں حسرت موہانی کی یہ تحریر جیتی جاگتی شہادت کا کام دیتی ہے۔

"سردست ہمارے نزدیک ہر محبِ ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمتِ دفاعی یعنی PASSIVE RESISTANCE کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیے[1]"

اس صدی کے آغاز میں ظفر علی خان، محمد علی اور ابوالکلام آزاد نے "زمیندار" "دی کامریڈ" "ہمدرد" اور "الہلال" کے ذریعے سے بیباک اور نڈر صحافت کے جس دور کا آغاز

---

[1] اردوئے معلّٰی۔ مئی ۱۹۰۷ ص ۴۵

کیا، اس کی بھی اصل ابتدا حسرت موہانی کی طرف سے ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۰۳ میں ماہنامہ اردوئے معلیٰ جاری کیا، جس میں ادبی مواد کے پہلو بہ پہلو سیاسی مواد شامل ہوتا تھا۔ یہ برعظیم کا پہلا اردو مجلّہ تھا جس نے سامراج کے خلاف پے دَر پے مقالے چھاپے اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ مسلم لیگ کی نرم اور دھیمی سیاست کو چھوڑ کر ایک انتہا پسندانہ سامراج دشمن سیاست کو اپنائیں۔

آزادیٔ صحافت کی خاطر قید و بند کے مصائب جھیلنے میں بھی حسرت موہانی کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۸ میں ایک ایسا سیاسی مقالہ چھاپا جسے حکومت نے قابلِ اعتراض قرار دیتے ہوئے حسرت موہانی سے پوچھا کہ اس کا مصنّف کون ہے لیکن حسرت موہانی نے صحافت کے اعلیٰ اصول پر کاربند رہتے ہوئے مآخذ کے افشا سے انکار کر دیا۔ اس پر انھیں دو سال کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا اور ان سے باقاعدہ چکّی پسوانے کی مشقت لی گئی۔ ایک سال بعد رہا ہوئے تو دوستوں نے مشورہ دیا کہ اردوئے معلیٰ سیاست سے کنارہ کش ہو جائے۔ اس پر حسرت نے "اردوئے معلیٰ کی پالیسی" کے عنوان سے ایک اداریے میں لکھا:

"مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ، عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ایک ایسی چیز ہے جس کو محض کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کرنا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے، جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔[۲]"

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ظفر علی خان، محمد علی، اور ابوالکلام آزاد نے آزادیٔ صحافت کی خاطر جو قربانیاں دیں، ان کا آغاز اس کے چار سال بعد ہوا۔

حسرت کے سیاسی نظریات کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ ریڈیکل سیاست اور مسلم لیگ کی مخالفت کے دَور میں بھی اسلامی سیاست کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ حقیقت پسندانہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۷ میں ایک مقالے کے دوران میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر

---

[۲] اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۰۹

کرتے ہوئے انھیں دو قومیں قرار دیا۔ مسلمانوں کی کمزور سیاسی پالیسی کو تعلیم میں کمی، آغازِ حریت کی قدرتی جھجک، سرکاری ملازمتوں کے بآسانی مل جانے اور دوسری قوموں کے ساتھ رقابت سے منسوب کیا اور بتایا کہ جب مسلمان ہندوؤں کے برابر ہو جائیں گے تو:

"اس وقت یقیناً وہ طلبِ حقوق میں زیادہ بیباک ہو جائیں گے کیونکہ حریت کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی ابتدا ضرور ہوتی ہے لیکن انتہا نہیں ہو سکتی۔ یعنی ایک بار دل میں پیدا ہو کر وہ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ گھٹنے کا نام نہیں لیتی۔"

۱۹۰۹ میں انھوں نے "مسئلہ مسلمانان و ہنود" کے عنوان سے بپن چندر پال کا ایک مفصل مقالہ چھاپا، جس کا یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے:

"بہر حال وطن پرستانِ ہند کو کسی نہ کسی روز یہ مسئلہ ضرور حل کرنا ہوگا۔ ہندوؤں کو تو یہ ماننا پڑے گا کہ سلطنتِ ہند کی عام زندگی میں مسلمان بھی ان کے ہم پلہ ہیں اور مسلمانوں کی علٰحدگی کا خبط اور افضلیت کا گمان دماغ سے نکالنا اور ہندوستان کی قوم الاقوام (وہ قوم جو مجموعہ ہوگی بہت سی قوموں کا) کے ایک جزو کی حیثیت سے اپنے جائز رستے کو قبول کرنا ہوگا۔

"غرض کہ ہمیں اس دشواری کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے حل کرنے میں بطور رفع الوقتی چند روزہ التوا بے شک ممکن ہے لیکن ہمیشہ کے لیے اس سے پہلوتہی کرنا محالات سے ہے۔ پس اس مسئلے کے لیے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ اس کا فیصلہ اسی زمانے میں ہو جائے، جب کہ اہلِ برطانیہ کی زبردست قوت ملک میں موجود ہے، جس کی وجہ سے ان دونوں قوموں میں جسمانی کشمکش یا خونریزی کسی طرح نہ ہونے پائے گی۔"[۳]

۱۹۲۴ میں حسرت موہانی کے خیالات میں نیا انقلاب آیا۔ انھوں نے سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں کے پیشِ نظر ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ عزائم کو مکمل طور پر بھانپ لیا اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ منصوبہ پیش کیا کہ برِعظیم میں مسلم اکثریتی علاقوں کی الگ ریاستیں

۳۔ اردوئے معلیٰ نومبر ۱۹۰۹

قائم ہوں، بلکہ ہندو انڈیا کے اندر بھی جہاں کسی چھوٹے سے علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، وہاں ایک خود مختار ریاست قائم کر دی جائے اور اس کے بعد ہندو اور مسلمان ریاستیں ایک فیڈریشن میں منسلک ہو جائیں۔ ہندوؤں کے مشہور رہنما لالہ لاجپت رائے نے اسی منصوبے کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک زیادہ واضح منصوبہ پیش کر دیا جس میں کہا گیا کہ:

"میری اسکیم کے مطابق مسلمانوں کی چار مسلم ریاستیں ہوں گی۔ اوّل، صوبہ سرحد۔ دوم، مغربی پنجاب۔ سوم، سندھ۔ چہارم، مشرقی بنگال۔ اگر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں اتنے بڑے مسلم اکثریتی علاقے موجود ہوں کہ انھیں صوبہ بنایا جا سکے، تو بنا لیا جائے۔ لیکن یہ بات صاف صاف جان لی جائے کہ یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہوگا۔ یہ ہندوستان کا واضح بٹوارہ ہوگا۔ جس میں ایک اسلامی ہند ہوگا۔ دوسرا غیر اسلامی ہند۔"

گویا حسرت موہانی کے وفاقی منصوبے سے روشنی پاکر لالہ لاجپت رائے نے برعظیم کی واضح تقسیم کا منصوبہ پیش کر دیا۔

اس کے بعد حسرت موہانی مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے اور یہ وابستگی تادمِ آخر قائم رہی۔ وہ جداگانہ انتخاب کی حمایت بھی شد و مد سے کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس مسئلے پر مسلم لیگ دو متوازی جماعتوں میں بٹ گئی تو حسرت موہانی شفیع لیگ میں شامل ہو گئے جو جداگانہ انتخاب پر زور دیتی تھی اور اس کے بعد حسرت موہانی تحریکِ پاکستان میں پیش پیش رہے اور یہ بات بھی ان کی سیاسی بلند کرداری کا ایک بیّن ثبوت فراہم کرتی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے بہت سے لیڈر پاکستان میں آ بسے، لیکن حسرت موہانی ہندوستان میں رہے اور مسلمانوں کے حقوق کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔

حسرت موہانی کا سامراج دشمن کردار بھی آخر تک قائم رہا۔ وہ کانگرس میں شامل ہوئے تو اس کے پلیٹ فارم پر سب سے پہلے انہی نے یہ آواز بلند کی کہ کانگرس کا نصب العین درجۂ نو آبادیات کی جگہ کامل آزادی ہو اور مسلم لیگ میں آئے، تو اس کے پلیٹ فارم سے بھی یہی مطالبہ کیا۔ چنانچہ انہی کی تحریک پر ۱۹۳۷ میں مسلم لیگ نے درجۂ نو آبادیات کی جگہ کامل آزادی کو اپنا نصب العین بنایا۔

حسرت موہانی کے سیاسی عقیدے کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ سوشلزم کے حامی تھے لیکن وہ سوشلزم کو محض ایک معاشی منصوبے کے طور پر پسند کرتے تھے۔ مارکس کے پورے فلسفے سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا، کیونکہ وہ پکے مسلمان تھے اور کسی ایسے نظریے کو قبول نہیں کر سکتے تھے جس کی بنیاد مادیت یا الحاد پر ہو۔ یہ ہے ایک مختصر تجزیہ، حسرت موہانی کی سیاسی زندگی اور سیاسی نظریات کا، جس کی بنیاد دیانت پر تھی، اسلام دوستی پر تھی، اور سامراج دشمنی پر تھی۔

مسلم ثقافت ہندوستان میں

مولانا عبدالمجید سالک

اس کتاب میں بڑی وضاحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے برِصغیر پاک و ہند کو گزشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا، مسلم ثقافت کی بنیادیں کن اصول و عقائد اور اقدار و مبادیات پر قائم تھیں اور قدیم ہندوستان کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح میں ان اصول و اقدار نے کتنا حصہ لیا۔ مسلم حکومتوں نے علم و تعلیم، صنعت و حرفت اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں کس قدر دریا دلی سے کام لیا اور ان کے عہد میں تہذیب و ثقافت کو کتنا فروغ ہوا۔ مسلمانوں کا دورِ عروج ختم ہونے کے بعد تجدید و اصلاح کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئیں، شاہ ولی اللہ اور سید احمد خاں کی تحریکوں کے کیا کیا نتائج نکلے۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند میں دینی و سیاسی بیداری پیدا کر کے کس منزل کی طرف ان کی راہ نمائی کی اور قائدِ اعظم نے کس طرح مسلمانوں کو متحد و منظم کیا اور تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنا کر مسلم ثقافت کی تاریخ میں ایک نئے اور درخشاں باب کا اضافہ کیا۔

قیمت ۱۴/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور